اسلام کا جناتی تصور

تبصرہ نگار : ایڈورڈ ڈبلیو سعید*

کتاب : *God Has Ninety-Nine Names: Reporting from a Millitant Middle East.*
by Judith Miller, Simon & Schuster, 574 pp, $30.

جوڈتھ ملر ''نیویارک ٹائمز'' کی رپورٹر ہیں جو اکثر مشرقِ وسطیٰ پر ہونے والے سیمیناروں اور پروگراموں میں نظر آتی ہیں۔ان کا کام ''اسلامی خطرے'' کا پرچار کرنا ہے۔ان کا خصوصی مشن ہی یہی ہے کہ اس نظریے کو ایک آفاقی نظریے (millenniel thesis) کے طور پر پروان چڑھایا جائے کہ عسکری اسلام مغرب کے لیے خطرہ ہے۔کسی بیرونی خطرے کی تلاش سوویت روس کے بعد اسلام پر آ کر رک گئی ہے۔اسلام جس طرح آٹھویں صدی میں عیسائی دنیا کے لیے خطرے کی علامت بن چکا تھا اسی طرح آج بھی اسلام کو پُرتشدد اور خطرناک سمجھا جارہا ہے۔باوجود اس کے کہ آج اکثر مسلم ممالک انتہائی غربت کا شکار ہیں، عسکری اور سائنسی میدانوں میں اتنے پس ماندہ ہیں کہ کسی اور کے لیے تو کیا خطرہ ہوں گے خود اپنے شہریوں کے لیے خطرہ ہیں اور باوجود اس کے کہ ان میں جو سب سے طاقت ور ممالک ہیں مثلاً سعودی عرب، مصر، اردن اور پاکستان وہ سب امریکہ کی مٹھی میں ہیں تو کیا وجہ ہے کہ ملر، سیموئیل ہنٹنگٹن، مارٹن کریمر، برنارڈ لیوس، ڈینئیل پائپس، سٹیون ایمرسن اور بیری رُوبن بشمول اسرائیلی دانش وروں کا ایک جھتہ دنیا کو یہ یقین دلانے میں مصروف ہیں کہ خطرہ ہماری آنکھوں کے سامنے ناچ رہا ہے اور اس کی دہشت جور و جبر اور تشدد سے بچنے کے لیے اسلام کو ختم کر دینا ضروری ہے۔اور اس میں وہ اپنے ٹی وی

---

* Edward W. Said, "A Devil Theory of Islam," *The Nation*, Vol. 263 Iss. 5 . August 12/19, 1996, pp. 28-32

(ترجمہ و تلخیص: راشد بخاری)

پروگراموں اور کتابوں کے ذریعے اپنی بھرپور معاونت کا یقین بھی دلاتے ہیں۔ ''اسلامی خطرے'' کو بے حد مبالغے کے ساتھ خوفناک بنا کر پیش کیا جا رہا ہے اور اس نظریے کو تقویت دی جا رہی ہے کہ ہر دھماکے کے پیچھے عالمی سطح کی ایک سازش موجود ہے۔

سیاسی اسلام اب تک جہاں بھی اقتدار میں آیا ہے عمومی طور پر ناکام ہی ثابت ہوا ہے۔ ایران ایک ممکنہ استثناء ہے۔ لیکن نہ تو سوڈان ہی جو ایک اسلامی ریاست ہے اور نہ ہی الجزائر، جہاں اسلامی گروہوں اور ظالم فوجیوں کے درمیان لڑائی جاری ہے، کسی نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کر سکے ہیں بلکہ بجائے اس کے وہ غریب سے غریب تر ہو چکے ہیں اور انہوں نے دنیا کے سٹیج پر اپنا کردار محدود سے محدود تر کر لیا ہے۔ تاہم مغرب میں اسلامی خطرے سے متعلق مباحث میں اس حد تک سچائی ضرور موجود ہے کہ مسلمانوں میں اسلام کے لیے اپیل بڑھ گئی ہے جس سے پورے مشرقِ وسطیٰ میں امریکہ اسرائیل گٹھ جوڑ کے خلاف مزاحمت میں اضافہ ہوا ہے۔ لیکن نہ تو حزب اللہ اور نہ حماس وہاں جاری پیش رفت میں (جسے امن کا عمل کہا جاتا ہے) کوئی بڑی رکاوٹ ڈال سکتے ہیں۔ آج اکثر عرب مسلمان اتنی کم حوصلگی، پژمردگی اور غیر یقینی کیفیت کا شکار ہیں اور نااہل اور ظالم حکمرانوں کے پنجے میں ہیں کہ مغرب کے خلاف کسی نوعیت کی اسلامی مہم چلانا ان کے بس کی بات نہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اکثر طبقہ اشرافیہ ''انتہا پسندوں'' کے خلاف مارشل لاء اور دیگر غیر قانونی اقدامات میں حکمرانوں کے ساتھ ملی بھگت کے ذریعے ان کے ہاتھ مضبوط کرتا ہے۔ چنانچہ یہ بات سمجھ سے بالاتر ہے کہ آخر کیوں اسلام سے متعلق مباحث میں خطرے اور خوف کی گھنٹیاں بجائی جاتی ہیں؟ یقیناً یہاں خود ہلاکتی بم دھماکے اور دہشت گردی کے واقعات ہوئے ہیں لیکن انہوں نے سوائے امریکہ اسرائیل اور ان کی حمایتی مسلم دنیا کی حکومتوں کے ہاتھ مضبوط کرنے کے کیا مقصد پورا کیا ہے؟

> اسلام جس طرح آٹھویں صدی میں عیسائی دنیا کے لیے خطرے کی علامت بن چکا تھا اسی طرح آج بھی اسلام کو پُرتشدد اور خطرناک سمجھا جا رہا ہے۔

ان سوالوں کا جواب میرے خیال میں یہ ہے کہ اس طرح کی کتابوں کو ہتھیار کے طور پر استعمال کیا

جار ہا ہے تا کہ امریکہ اسرائیل غلبے کے خلاف کسی بھی عرب یا مسلم مزاحمت کو کچلا جا سکے۔ مزید یہ کہ ایسی یکطرفہ اور ضد پر مبنی پالیسی کے ذریعے دنیا کے ایک اہم اور تیل سے مالا مال خطے کو اسلام ازم سے متعلق قرار دیا جا سکے۔ اسلام مخالف مہم سے بتدریج اسلام اور عرب اور مغرب یا اسرائیل کے درمیان یکساں سطحی مذاکرات کا امکان ختم ہو جائے گا۔ ایک پوری تہذیب کو ختم کرنا اور غیر انسانی قرار دینا محض اس بنا پر کہ جو برنارڈ لیوس کے الفاظ میں ''جدیدیت کے خلاف ہے'' مسلمانوں کو ایک ایسے عنصر میں تبدیل کرنے کے مترادف ہے جو معالجاتی اور تادیبی کارروائی کا مستحق ہو۔ میں نہیں چاہتا کہ یہاں مجھے غلط سمجھا جائے۔ صرف اسلام کے ساتھ ہی نہیں بلکہ اگر یہودیت اور عیسائیت کے ساتھ بھی ایسا برتاؤ کیا جائے گا تو وہ تباہ کن حد تک برے نتائج کا حامل ہوگا، جس کی لازماً مخالفت کی جانی چاہیے۔ صرف سعودی عرب، مغربی کنارے اور غازا، پاکستان، سوڈان، الجزائر اور تیونس میں ہی نہیں بلکہ اسرائیل میں بھی، لبنان کے دائیں بازو والے عیسائیوں میں بھی (جن سے ملر کو ہمدردی ہے) بلکہ جہاں بھی تھیاکریسی کے رجحانات ظاہر ہوں غیر محتاط رویہ تباہی کا باعث بن سکتا ہے۔ میں اس بات پر بھی یقین نہیں رکھتا کہ مسلمان ممالک کی تمام خرابیوں کی وجہ صیہونیت یا استعماریت ہے۔ لیکن یہ کہنا اس سے کہیں دور کی بات ہے کہ اسرائیل اور امریکہ اور ان کے دانش ورٹولے نے ایک مجرد خیال، جسے اسلام کہا جاتا ہے، کو بدنام کرنے اور نفرت انگیز بنانے میں مفسدانہ اور مبارزانہ کردار ادا نہیں کیا ہے۔ اور ایسا جان بوجھ کر کیا گیا ہے تا کہ امریکیوں اور یورپیوں میں جو اسرائیل کو ایک حقیقی، لبرل، سیکولر متبادل دیکھنا چاہتے ہیں، اسلام سے متعلق نفرت اور غصے کے جذبات پیدا کیے جائیں۔ ملر نے اپنی کتاب کی ابتداء میں ہی اسرائیلی یہودیت کے دائیں بازو کے بارے میں کہا ہے کہ ''یہ ایک

اسرائیل اور امریکہ اور ان کے دانش ورٹولے نے ایک مجرد خیال، جسے اسلام کہا جاتا ہے، کو بدنام کرنے اور نفرت انگیز بنانے میں مفسدانہ اور مبارزانہ کردار ادا کیا ہے۔ تا کہ امریکیوں اور یورپیوں میں جو اسرائیل کو ایک حقیقی، لبرل، سیکولر متبادل دیکھنا چاہتے ہیں، اسلام سے متعلق نفرت اور غصے کے جذبات پیدا کیے جائیں۔

دوسری کتاب کا موضوع ہے''۔ حالانکہ یہ بہت حد تک اسی کتاب کا موضوع ہے جو اس نے لکھی ہے سوائے اس کے کہ اس نے اسے ''اسلام'' کے پیچھے پڑنے کے لیے جان بوجھ کر نظر انداز کیا ہے۔

دنیا کے کسی بھی اور حصے کے بارے میں لکھنے کے لیے ملر کو شائد نا اہل قرار دیا جائے۔ اس کے مطابق وہ مشرقِ وسطیٰ پر پچیس سال سے کام کر رہی ہے جب کہ عربی یا فارسی کے بارے میں اسے بہت کم معلومات حاصل ہیں۔ یہ ناممکن ہے کہ کسی ایسے صحافی کو سنجیدگی سے لیا جائے جو روس، فرانس، جرمنی، یا لاطینی امریکہ یا شائد چین اور جاپان پر کام کر رہا ہو اور متعلقہ خطوں کی زبان سے واقفیت نہ رکھتا ہو۔ لیکن اسلام پر کام کے لیے زبان کا علم چنداں ضروری نہیں کیوں کہ جس چیز پر کام کیا جا رہا ہے وہ کوئی حقیقی تہذیب یا مذہب نہیں بلکہ ایک ''نفسیاتی بدہیئتی'' ہے۔

سیاست اور تاریخ کے بارے میں اس کی معلومات کیا ہیں؟ اسلامی ملکوں (مصر، سعودی عرب، سوڈان) پر لکھے ہوئے اس کے ابواب کسی کہانی یا قصے سے شروع ہوتے ہیں اور اچانک کسی غیر مستند تاریخی بیان کی طرف مڑ جاتے ہیں۔ جس سے لگتا ہے کہ یہ کسی خود فریبی کے شکار کالج کے طالب علم کا کام ہے۔ بد سلیقگی سے پیش کیے گئے بیش تر غیر مستند حوالہ جات بظاہر اس لیے ہیں کہ وہ مصنفہ کے مواد پر عبور کو ظاہر کریں لیکن درحقیقت یہ اس کے افسوس ناک تعصبات اور کج فہمی کا اظہار کر رہے ہیں۔ مثال کے طور پر سعودی عرب پر لکھے گئے باب میں وہ پیغمبر محمد [صلی اللہ علیہ وسلم] پر اپنا بہترین ذریعہ علمی ایک فرانسیسی ماہر علوم شرقی میکسم روڈنسن کو بتاتی ہے، جو ایک مشتبہ مارکسسٹ محقق ہے اور جس نے پیغمبر [صلی اللہ علیہ وسلم] کی سوانح مروّجہ اور روایتی طریقہ کار پر طنز مگر تبحر علمی کے ساتھ لکھی ہے۔ لیکن ملر نے محمد [صلی اللہ علیہ وسلم] کی زندگی اور خیالات پر اپنے تحریر کردہ مختصر خلاصے میں اس کتاب سے صرف اتنا ہی حاصل کیا ہے کہ وہ شخص [حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم] جسے روڈنسن نے چارلی میگرے* اور حضرت عیسیٰؑ کا مجموعہ قرار دیا ہے اس میں اگر قابل نفرت نہیں تو کوئی مضحکہ خیز چیز ضرور موجود ہے [نعوذ باللہ]۔ ملر ہمیں یہ بتاتی ہے (اور

---

* چارلی میگرے (چارلس اعظم ۸۱۴ء-۷۴۲ء) جس نے (۸۱۴ء-۸۰۰ء) مغربی یورپ کی تمام عیسائی دنیا پر حکومت کی اور یہ بادشاہت کئی صدیوں تک کسی مخالفت کے بغیر چلی۔ خصوصاً اس کا دربار علمی، سیاسی اور انتظامی ہر پہلو سے نمایاں اور مرکزی حیثیت کا حامل رہا۔ [مدیر]

بالکل غیر متعلقہ طور پر) کہ وہ اس [روڈنسن کی کتاب] سے قائل نہیں ہو سکی۔ اس [ملر] کے نزدیک محمد [صلی اللہ علیہ وسلم] یہودیت کے مخالف ایک مذہب کی بنیاد رکھنے والے ہیں اور یہ [مذہب] تشدد اور جنون سے بندھا ہوا ہے۔ اس [ملر] نے [حضرت] محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک بھی مسلمان محقق کا حوالہ نہیں دیا۔ ذرا کسی ایسی کتاب کا تصور کریں جو حضرت عیسیٰؑ یا حضرت موسیٰؑ پر امریکہ میں چھپی ہو اور جس میں کسی بھی عیسائی یا یہودی عالم کا حوالہ موجود نہ ہو!

ملر کی کتاب خیالات اور دلائل سے نہیں، بلکہ خودستائی کا شکار اور قائل نہ کر سکنے والے بدمعاشوں، عامیوں اور ان کے نقادوں کے نہ ختم ہونے والے انٹرویوز سے بھری پڑی ہے۔ اس کی مختصر کہانیوں سے جب ہم آگے جاتے ہیں تو ہمیں غیر دلچسپ، غیر معیاری، بے راہ رو اور پیچیدہ بیانات سے واسطہ پڑتا ہے۔ اسی طرح کا ایک مخصوص جملہ ہے کہ ''اپنے ملک کی بدنظمی اور انتشار کی تاریخ سے آگاہ شامیوں (دنیا کے کس ملک کے بارے میں یہ بیان درست نہیں ہے؟) نے ایک اور انارکی یا انتشار کی طرف واپسی یا قوت کے حصول کی ایک اور طویل اور خونی جدوجہد کے امکانات کا اندازہ کر لیا تھا''۔ (کیا یہ نوآبادیاتی نظام کے بعد صرف شام کے لیے ہی درست ہے یا ایشیاء، افریقہ، لاطینی امریکہ کے بیسیوں دوسرے ممالک کے بارے میں بھی درست ہے؟) ''اور شائد عرب ریاستوں میں سے سب سے زیادہ سیکولر ریاستوں میں عسکری اسلام کی کامیابیاں تشویش ناک ہیں''۔

> سیاست اور تاریخ کے بارے میں اس کی معلومات کیا ہیں؟ اسلامی ملکوں (مصر، سعودی عرب، سوڈان) پر لکھے ہوئے اس کے ابواب کسی کہانی یا قصے سے شروع ہوتے ہیں اور اچانک کسی غیر مستند تاریخی بیان کی طرف مڑ جاتے ہیں۔ جس سے لگتا ہے کہ یہ کسی خود فریبی کے شکار کالج کے طالب علم کا کام ہے۔

تحریری آہنگ کے جبر و اکراہ اور جبڑے ہلا دینے والے انداز سے قطع نظر کتاب میں کوئی ٹھوس خیال (آئیڈیا) بھی پیش نہیں کیا گیا بلکہ غلط اور غیر منطقی مفروضات کا ایک تسلسل ہے جس میں شامیوں کی سوچ تو کیا نظر آئے گی خود ملر کے ''افکار'' منعکس ہوتے ہیں۔

ملر نے اپنے اکثر بیانات میں ''میرے دوست'' کے الفاظ کی ملمع کاری سے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ جو بات کہہ رہی ہے یا جن لوگوں کے بارے میں کہہ رہی ہے انہیں وہ مکمل طور پر جانتی ہے۔ میں نے ابھی صرف نصف ہی کتاب پڑھی تھی اور ۲۴۷ بار ان الفاظ کو شمار کیا تھا۔ اسلامی ذہن کو سمجھنے میں ایک طویل انحراف کیا گیا ہے اور مقامی سیاست، سیکولر اداروں کی کارکردگی اور اسلام پسندوں اور قوم پرستوں کے مابین مکالموں اور مباحثوں کو مکمل نظر انداز کیا گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مصنفہ آرکون، جابری، طرابشی، ایڈر نس، حنفی یا دجیت کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی جس کے خیالات و نظریات اسلامی دنیا میں گرم مباحثوں کا موضوع بنے ہیں۔

تجزیے میں غلطی کی ایک اور مثال اسرائیل پر لکھے گئے باب میں نظر آتی ہے (اس کا عنوان ہی غلط ہے کیوں کہ یہ سارا باب فلسطین کے بارے میں ہے)۔ یہاں مصنفہ نے ان تبدیلیوں کو نظر انداز کر دیا ہے جو انتفادہ اور اسرائیل کے تین عشروں پر محیط قبضے کے دیرپا اثرات سے پیدا ہوئی ہیں۔ مصنفہ اس نفرت اور ہیجان کے بارے میں بھی کچھ نہیں بتاتی جو معاہدۂ اوسلو اور یاسر عرفات کے شخصی اقتدار سے فلسطینیوں میں پیدا ہو چکا ہے۔ اگرچہ تحریر میں ''حماس'' کا بہت ذکر ہے لیکن مصنفہ اس کو کہیں بھی اسرائیل کے زیر قبضہ علاقوں کی ناگفتہ بہ حالت سے متعلق نہیں کر سکی ہے۔ مثال کے طور پر مصنفہ اس واحد فلسطینی یونیورسٹی (غازا اسلامی (حماس) یونیورسٹی) کا ذکر گول کر گئی ہے جو فلسطینیوں نے نہیں بلکہ اسرائیل نے پی ایل او کی سرگرمیوں کو محدود کرنے کے لیے شروع کی۔ مصنفہ [حضرت] محمد [ؐ] کی یہودیوں کے خلاف کارروائیوں کو ''لوٹ مار'' قرار دیتی ہے مگر ان اسرائیلی اعتقادات، بیانات اور قوانین کا ذکر نہیں کرتی جن کے ذریعے ربانی انداز میں غیر یہودیوں کو جلاوطن کر دیا جاتا ہے یا انہیں مار دیا جاتا ہے یا ان کے گھر گرا دیے جاتے ہیں اور جسے سارا رائے نے منظم معاشی ترقی (systematic economic development) کا نام دیا ہے۔

[ایک طرح کی] دیوانگی کے ساتھ وہ ہمیں بتاتی ہے کسی کا مذہب کیا ہے؟ جیسے فلاں عیسائی ہے، فلاں سنی مسلمان ہے اور فلاں شیعہ مسلمان ہے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن اس میں بھی وہ اکثر غلطی کر جاتی ہے۔ وہ ہشام شارابی کو اپنا دوست اور عیسائی بتاتی ہے حالانکہ وہ سُنی مسلمان ہے۔ بدرالجح کو وہ مسلمان کہتی ہے

جب کہ وہ عیسائی ہے۔اس پر مستزاد یہ کہ وہ اپنے مذہبی پس منظر اور سیاسی وابستگی کے بارے میں بتانے پر یقین نہیں رکھتی۔کیا ہمیں یہ بات فرض کر لینی چاہیے کہ اس کا مذہب (جو میرا نہیں خیال کہ اسلام یا ہندو ازم ہوگا) غیر متعلق ہے؟

تاہم وہ دوسرے لوگوں اور واقعات کے بارے میں اپنا ردعمل ظاہر کرنے میں بہت تیزی کا مظاہرہ کرتی ہے۔جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اردن کے شاہ حسین کینسر کا شکار ہیں تو وہ گہرے غم اور اندوہ کا شکار ہو جاتی ہے۔اس نے کبھی اس پر نہیں سوچا کہ وہ ایک ایسی پولیس اسٹیٹ چلا رہا ہے جس میں افراد پر تشدد کیا جاتا ہے، بلا جواز قید میں ڈالا جاتا ہے اور جن پر ہر طرح کا ظلم روا رکھا جاتا ہے۔جب اسے معلوم ہوتا ہے کہ لبنان میں عیسائیوں کی ایک مقدس عمارت کی بے حرمتی ہوئی ہے تو اس کی آنکھیں آنسوؤں اور غصے سے بھر جاتی ہیں۔لیکن وہ اسرائیل میں ہونے والی دوسری بے حرمتیوں کا ذکر کرنے کی زحمت گوارہ نہیں کرتی مثلاً مسلمانوں کے قبرستانوں کی بے حرمتیاں، شام، لبنان اور فلسطین میں سینکڑوں دیہاتوں کو تباہ کر دینا وغیرہ۔اس کا غصہ اور حقارت جہاں ظاہر ہوتا ہے اس کی ایک مثال درج ذیل اقتباس سے مل سکتی ہے، جس میں وہ بورژوا طبقے کی ایک ایسی شامی خاتون پر دشنام طرازی کرتی ہے جس کی بیٹی حال ہی میں اسلامسٹ بن چکی ہے۔

وہ کبھی ان چیزوں کو نہ پا سکتی تھی، ایک متوسط طبقے کی عورت جن کی خواہش بھی نہیں کر سکتی۔مثلاً نہ ہی شادی کی شاندار پارٹی جس میں اس کی بیٹی روایتی سفید لباس اور ہیروں کا تاج پہنے ہوتی ہے، نہ ہی کافی ٹیبل پر آتش دان کے قریب بیٹھے ہوئے دولہا اور دلہن کی چاندی کی فریم میں فوٹو، نہ ہی سٹیج پر ناچتے ہوئے بیلے ڈانسرز اور نہ ہی صبح تک پانی کی طرح بہنے والی شیمپئن شراب۔شائد ندائن کے دوستوں کی بھی لڑکیاں اور لڑکے تھے جنہوں نے مصلحتاً انہیں اس لیے مسترد کر دیا تھا تا کہ اسد کی بے رحم اور بے روح حکومت کی ہمدردیاں حاصل کر سکیں۔اگر دمشق کے بورژوا طبقے کے ایسے ستونوں کی لڑکیاں بھی اسلام کی طاقت کے آگے سرنگوں ہو جائیں تو پھر محفوظ کون رہے گا۔

ملر کی اس کتاب کے بارے میں سب سے دلچسپ سوال یہ ہے کہ آخر اس نے یہ کتاب لکھی کیوں ہے؟ یقیناً کسی محبت کی وجہ سے نہیں۔مثال کے طور پر کہ وہ یہ تسلیم کرتی ہے کہ وہ لبنان سے خوف زدہ ہے

اور اسے ناپسند کرتی ہے، شام سے نفرت کرتی ہے، لیبیا پر ہنستی ہے، سوڈان کو درخورِ اعتناء نہیں سمجھتی، مصر پر افسوس کرتی ہے اور اس کی طرف سے تھوڑا خطرے کا بھی اظہار کرتی ہے اور سعودی عرب کو مسترد کرتی ہے۔ اس کی سب سے بڑی فکر منظم اسلامی عسکری خطرہ ہے، جو میرے خیال میں ایک ارب کی اسلامی دنیا کا پانچ فیصد بھی نہیں ہیں۔ وہ اسلام پسندوں کو سختی سے کچل ڈالنے کی حمایت کرتی ہے۔

فلسطین، مصر، اردن، کہیں بھی اگر اسلام پسندوں کو نشانہ بنایا جا رہا ہے تو جمہوریت کے فروغ اور قانونی طریقہ کار کے حوالے سے مصنفہ کسی ضمیر کی خلش میں مبتلا نہیں ہے۔ اور حقیقتاً ایک کراہت انگیز منظر میں وہ ایک ایسے مسلمان ''دہشت گرد'' کا انٹرویو کرتی ہے جو اسرائیلی پولیس کی تحویل میں ہے۔ اس سلسلے میں جو ہتھکنڈے استعمال کیے جاتے ہیں مثلاً ماورائے عدالت ہلاکتیں، آدھی رات کو گھروں میں گھس کر گرفتاری، گھروں کی مسماری وغیرہ، ان کو سادگی کے ساتھ نظر انداز کر کے اور قیدی پر جو تشدد کیا جا رہا ہے اس سے پہلو بچا کر وہ اس ہتھکڑی لگے انسان سے چند اپنی ہی نوعیت کے سوال کرتی ہے۔

> ملر نے عربوں کی سامی مخالفت کی مثالیں دی ہیں لیکن وہ بگین، شامیر، ایتن اور بیراک جیسے اسرائیلی قائدین کا ذکر گول کر گئی ہے جو فلسطینیوں کو دو ٹانگوں والے جانور، ٹڈے، کاکروچ اور مچھر کہتے ہیں۔ یہ قائدین فلسطینیوں سے ان کی حیثیت کے مطابق نبٹنے کے لیے جہاز اور ٹینک استعمال کرتے ہیں۔

بطور صحافی ملر نے جو سب سے بڑی ٹھوکر کھائی ہے وہ یہ کہ وہ صرف ایسی کڑیاں جوڑتی ہے، ایسا تجزیہ کرتی ہے اور ایسے نتائج نکالتی ہے جو عرب دنیا کی نفرت انگیز خصوصیتوں اور عسکریت سے متعلق ہوں۔ مجھے اس عمومی رائے سے کوئی اختلاف نہیں ہے کہ عرب دنیا اس وقت انتہائی درماندگی کا شکار ہے اور سابقہ تین عشروں میں میں نے اس بات کا بار بار اظہار بھی کیا ہے۔ اس کتاب کی مصنفہ کھلم کھلا ایک عرب مخالف اور اسلامی مخالف امریکی پالیسی کی موجودگی کی تصدیق کرتی ہے۔ لیکن حقائق پر اس کی گرفت کمزور ہے۔ لبنان ہی کو لیجیے وہ بشیر جمیل (Bashir Gemayel) کی ۱۹۸۲ء میں ہلاکت کا حوالہ دیتے

ہوئے یہ تاثر دیتی ہے کہ وہ عوامی مقبولیت کے سبب منتخب ہوا تھا۔ اور اس حقیقت کو قطعاً بھول جاتی ہے کہ وہ اس وقت اقتدار میں آیا تھا جب صبارہ (Sabara) اور شتیلا (Shetila) کیمپ کے قتل عام سے ذرا ہی پہلے اسرائیلی فوج مغربی بیروت میں تھی۔ اری لبرانی جیسے اسرائیلی ذریعوں کے مطابق وہ لبنان میں موساد کا آدمی تھا۔ وہ ایک کھلا قاتل، ٹھگ اور دھوکہ باز تھا۔ جیسے یہ بھی حقیقت ہے کہ لبنان کے موجودہ حکومتی ڈھانچے میں بھی ایسے ہی لوگ ہیں جیسے علی ہوبیکا (Eli Hobeika) جن پر کیمپ قتل عام کے براہ راست الزامات ہیں۔ ملر نے عربوں کی سامی مخالفت کی مثالیں دی ہیں لیکن وہ بیگن، شامیر، ایتن اور بیراک جیسے اسرائیلی قائدین کا ذکر گول کر گئی ہے جو فلسطینیوں کو دو ٹانگوں والے جانور، ٹڈے، کاکروچ اور مچھر کہتے ہیں۔ یہ قائدین فلسطینیوں سے ان کی حیثیت کے مطابق نبٹنے کے لیے جہاز اور ٹینک استعمال کرتے ہیں۔ جہاں تک شہریوں کے خلاف اسرائیل کی جنگ کے حقائق کا تعلق ہے --- جنگی قیدیوں اور مہاجر کیمپ میں رہنے والوں کے خلاف ایک مسلسل، منظم اور ماہرانہ مہم چلائی جا رہی ہے، دیہاتوں کی تباہی، ہسپتالوں اور سکولوں پر بمباری، جانے بوجھے منصوبے کے تحت لاکھوں افراد کو مہاجرین کی زندگی گزارنے پر مجبور کر دینا وغیرہ --- تو یہ سب حقائق دیگر باتوں میں دب کر رہ جاتے ہیں۔ ملر حقائق کو نظر انداز کر کے گفتگو کے ایسے حوالے دیتی ہے جن سے عربوں کو امریکی مدد وحمایت سے اسرائیلی تشدد و دہشت گردی کا نشانہ بننے کا صحیح مستحق قرار دیا جا سکے۔

> بطور صحافی ملر نے جو سب سے بڑی ٹھوکر کھائی ہے وہ یہ کہ وہ صرف ایسی کڑیاں جوڑتی ہے، ایسا تجزیہ کرتی ہے اور ایسے نتائج نکالتی ہے جو عرب دنیا کی نفرت انگیز خصوصیتوں اور عسکریت سے متعلق ہوں۔

اپنے اخذ کردہ کمزور نتائج میں ملر تسلیم کرتی ہے کہ ممکن ہے کہ وہ اپنی تنبیہ میں زیادہ سخت ہو گئی ہو، لیکن یہ سب سخت باتیں بھی اس علاقے اور یہاں کے لوگوں سے اس کی محبت کی وجہ سے ہیں۔ لیکن میں دیانتداری سے کسی ایسی چیز کے بارے میں نہیں سوچ سکتا جس سے وہ محبت کرتی ہو۔ نہ تو عرب معاشرے کے بارے میں وہ حتمی بات جو اس نے کی۔ نہ ہی جب وہ بڑے طمطراق سے کہتی ہے کہ عرب اپنی مہمان

نوازی اور سخاوت کے سلسلے میں کنفیوز ہیں، یا وہ زبانیں جو اس نے نہیں سیکھیں، یا وہ لوگ جن کا اس نے مذاق اڑایا، یا ایک خطے کی وہ تاریخ اور ثقافت جو اس کے نزدیک شور و غوغے کی ایک لمبی داستان ہے۔ وہ اس خطے کی زندگی میں داخل ہی نہیں ہوئی اس نے یہاں کے لوگوں کی گفتگوؤں کو براہ راست نہیں سُنا نہ یہاں کے ناولوں اور کتابوں کو پڑھا ہے، نہ ہی یہاں کی سماجی زندگی کی توانائی اور سلیقے کا اندازہ کیا ہے اور نہ ہی یہاں کے مناظر کو دیکھا ہے۔ لیکن شائد یہ وہ قیمت ہے جو ''ٹائمز'' کے ایک رپورٹر کو ''بے زار مہارت'' اور اعلیٰ عہدے کے حصول کے لیے ادا کرنی پڑتی ہے۔

آپ ملر کی اس کتاب سے نہیں جان سکتے کہ مشرقِ وسطیٰ اور اسلام کی پیش کش اور نمائندگی کے حوالے سے کسی بین العرب تنازع کا ذکر کیا گیا ہو۔ ذرائع علمی کا جو انتخاب اس نے کیا ہے وہ قطعاً یک طرفہ ہے، وہ عرب قوم پرستی، جسے اس نے اپنی کتاب میں کئی بار مردہ قرار دیا ہے، کی ایک دشمن ہے۔ امریکی پالیسی کی حمایتی اور فلسطینی قوم پرستی کی ایک طے شدہ دشمن۔ مختصراً ''ملر ایک خودرائے، ہٹ دھرم اور متعصب صحافی ہے جس کی یہ بھاری بھرکم کتاب اپنے بیانات کے اعتبار سے ضرورت سے زیادہ طویل اور اپنے تجزیے، اخذ کردہ نتائج، بنت اور حقائق کے اعتبار سے ضرورت سے زیادہ مختصر ہے۔ بے چارے مسلمان اور عرب جو شائد اس پر اعتبار کرتے ہیں انہیں دوست کے بھیس میں چھپے خفیہ مقاصد رکھنے والے مہمان کو پہچاننا چاہیے۔

[ایڈورڈ ڈبلیو سعید ایک فلسطینی نژاد عیسائی ہیں، ان کی تازہ ترین کتاب کا نام ہے: Peace and its Discontants: Essays on Palestine and the Middle East Peace Process (Vintage).]